شفیق نیازی

آنکھیں میری، باقی اُن کا

''اردو کا جنازہ ہے، ذا دھوم سے نکلے!'' یہ اعلان کراچی کے ایک مشہور اخبار نے کیا۔ یہ آج کی نہیں چوتھائی صدی پرانی خبر ہے۔ جب ذوالفقار علی بھٹّو کا طوطی بول رہا تھا۔ اور وہ وادیٔ مہران کے خوبصورت باشندوں کا دل جیتنے کی سیاسی کوششیں کر رہا تھا۔

بھٹّو نے صوبۂ سندھ کی زبان کو بھی اردو کے برابر صوبے کی دوسری سرکاری زبان قرار دیا تو اردو کے عاشق مہاجروں پر جیسے ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ کراچی کے اخباروں میں اردو پر نوحہ اور مرثیہ خوانی شروع ہوئی۔ مذکورہ بالا مصرع اخبار نے شائع کیا اور کراچی میں آگ لگا دی۔ اور وہاں صوبائیت کا پہلا بھوت پیدا کیا۔ اب کچھ اپنے بارے میں ...

میں ان دنوں کراچی میں دہلی کا مہاجر تھا۔ دہلی میں پیدا ہوا تو اپنے گھر میں اردو ہی سنی، بولی اور '' قائدِاعظم زندہ باد'' کہا لیکن خدا گواہ ہے کہ کراچی آیا تو میں نے پاکستانی سیاستدانوں اور حکومتوں کے پریشر میں بھی ''ہندوستان مردہ باد'' کبھی نہیں کہا۔ کافی عرصے تک قائدِ اعظم کے قاتلوں سے رسّہ کشی کے بعد پھر ہجرت کی اور اب برسہا برس سے امیریکا کا شہری ہوں۔ تمام شریف النفس پاکستانی امیریکنز کی طرح سچّے دل سے بآوازِ بلند ''امیریکا زندہ باد'' کہتا ہوں اور پاکستان مردہ باد نہیں کہتا۔ کیوں کہ بقول اقبال ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' اور یہ بھی درست ہے کہ جب

بلبل نے آشیانہ چمن سے اُٹھا دیا
اس کی بلا سے بوم بسے یا ہُما رہے

شراب نہ پینا اور گن گن کر، دکھا دکھا کر نمازیں پڑھنا میرے لیے کافی نہیں۔ کسی دولتمند سعودی یہودی بادشاہ یا کسی ظالم ڈکٹیٹر کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنا ہی میرا

جہادِ اکبر ہے۔ اس کے بدلے کسی جنّت کا طلب گار بھی نہیں ہوں۔ اور اگر اس کی پاداش میں کوئی جاہل مُلّا مجھے جہنّم میں ڈال دے تب بھی میں شہدائے کربلا کی راہ نہیں چھوڑوں گا۔ کیوں کہ میں بھی قائدِ اعظم کی طرح ''بگڑا ہوا'' مسلمان ہوں اور اپنے قاتلوں کا انتظار کر رہا ہوں کہ ''بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔''

اپنے بزرگوں کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ سچ بولنا ضروری ہے۔ پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا جائے تب بھی۔ لہٰذا مجھے بھی علی الاعلان دکھ ہوا کہ مذکورہ بالا کراچی کے اخبار نے سندھیوں کے دل میں مہاجروں کی طرف سے رنج پیدا کیا۔ لیکن اخبار نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ یہ سندھی ہی ہیں جنھوں نے تقسیمِ ہند کے وقت ننگے بھوکے مہاجروں کو اپنے کپڑے اور روٹیاں دی تھیں۔ سندھیوں نے مدینہ منوّرہ کے انصار کا رول ادا کیا اور اس کے بعد بھی مہاجروں سے اپنی قربانیوں کا کبھی کوئی صلہ نہیں مانگا۔

بعض احسان فراموش مہاجر اس حقیقت کو سمجھیں یا نہ سمجھیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک کڑوی سچّائی ہے اور تاریخ میں درج ہے لیکن آج بہت کم مہاجر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ پاکستان میں مہاجروں کی سب سے پہلی بستی پیر الٰہی بخش کالونی بھی ایک سندھی ہی نے اپنے خونِ جگر سے تعمیر کی تھی۔ آج بھی وادیٔ مہران کے باشندے ہی مہاجروں کے قدرتی ساتھی ہیں۔

دوسری کڑوی سچّائی یہ ہے کہ اردو صرف ایک رابطے کی زبان ہے۔ لہٰذا اب جو لوگ پاکستان چھوڑ کر امیریکا ہجرت کر کے آئے ہیں اگر ''اردو اردو'' کرنا چھوڑ دیں اور اس زبان کو صرف ایک ذریعۂ بیان ہی رکھیں، جزوِ ایمان نہ بنائیں تو انھیں اپنے وطن میں وہ تکلیف نہیں ہوگی جو تقسیمِ ہند کے بعد کراچی کی طرف ہجرت کرنے والوں کو پاکستان میں ہوئی۔

تقسیمِ ہند کے موقعے پر جہاں ہزاروں لاکھوں ہندو، مسلمان اور سِکھ عورتوں کی عصمت دری ہوئی وہاں اردو زبان کے ساتھ بھی زنا بالجبر ہوا اور آج تک جاری ہے۔ دیوار کے اُدھر اس میں سنسکرت کے موٹے موٹے لفظ ٹھونسے اور دیوار کے اِدھر عربی اور فارسی کے موٹے لفظوں سے اردو کو لہولہان کیا۔ برِ صغیر ہند و پاکستان کے ایک ارب سے زیادہ لوگوں کے باہمی رابطے کی زبان، جسے اُدھر ہندی اور اِدھر اردو کہتے ہیں، اپنے ہی بیٹوں کی بوالہوسی کا شکار ہوگئی۔

اب حالت یہ ہے کہ ریڈیو پاکستان کی خبریں کوئی ہندوستان میں سمجھ سکتا ہے

اور نہ آکاش وانی کی خبریں کوئی پاکستان میں سمجھ سکتا ہے اور ایٹمی جنگ کے مسائل زیرِ بحث ہیں۔ لے دے کر ایک غیر ملکی زبان انگریزی سے کام چل رہا ہے۔

پاکستانی ادیبوں کی اردو بھی خود پاکستانی عوام کے سر سے اوپر گذر جاتی ہے۔ یہی حال سرحد کے اُس پار ہے۔ اردو یعنی ہندی زبان، سنسکرت کی ٹھوسم ٹھانس کی وجہ سے ہندوستان کی جنتا نہیں سمجھ سکتی۔ گویا اردو کے بھاگ میں ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔''

اردو یعنی ہندی کوئی بے غیرت زبان نہیں تھی، مرگئی۔ اب اس کی لاش کا جھنڈا بنا کر سمادھیوں اور قبروں پر لہرایا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ عُرس ہو رہے ہیں اور چندے جمع کیے جا رہے ہیں۔

اردو کے نام پر چندہ بٹورنے والوں کا دعویٰ ہے کہ اردو اُن کی مادری زبان ہے۔ لیکن چندہ دینے والوں میں صرف وہ دل والے آگے آگے ہیں، جن کی مادری زبان اردو نہیں۔ وہ اردو کو رابطے کی زبان سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ صرف یہی زبان ہے، جو ساؤتھ ایشیا کے ایک ارب سے زیادہ لوگوں کے درمیان لگاؤ پیدا کر سکتی ہے۔ اردو زبان یہی کام یہاں امیریکا میں بسنے والے ساؤتھ ایشینز کے لیے کر سکتی ہے۔

دلوں سے علاقائی اور مذہبی نفرتیں نکال دی جائیں تو ہم لوگ امیریکا میں اردو/ ہندی سے نیک اور انیک فائدے اُٹھا سکتے ہیں۔ کم از کم ساؤتھ ایشین امیریکن مسلمانوں کو متّحد کر کے اس کی ابتداء کی جا سکتی ہے۔

ابتداء ہوچکی ہے۔ صرف سدرن کیلیفورنیا میں اردو کلچرل سوسائیٹی، انجمن ترقیٔ اردو، اردو مرکز، حلقۂ شعر و ادب اور دوسرے کئی ادارے اپنے اپنے طور پر کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ یہ سب آپس میں تعاون کریں۔ کم از کم اتنا ضرور کریں کہ اردو کا دامن مزید داغدار نہ کریں۔

اِن سے اچھی آس لگا کر بھی ہم کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو کے نام پر مضحکہ خیز کارروائیاں جاری ہیں۔ بعض انعام یافتہ اردو شاعر اور افسانہ نگار بھی اس الزام سے بری نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر اردو کے ایک بڑے ہی نیکدل ہمدرد کے ساتھ، جس کی مادری زبان بھی اردو نہیں، ایک نہایت بیہودہ مذاق کیا گیا، جس کے بعد اس کا دل اور اس کی پیاری سی بیوی کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بچارے محفل کے بیچ ہی میں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اس تماشے کے

ذمے داروں میں کسی اللّٰہ کے بندے نے اُن سے معافی نہیں مانگی اور نہ ہی اُن کو روکنے کی کوشش کی تو پچھلی سیٹوں پر ایک صاحب سے یہ بے ادبی برداشت نہ ہوئی۔ انھوں نے سرگوشی کے انداز میں طنز کیا: ''اردو مرگھٹ زندہ باد!''

تفصیل کافی شرمناک ہے۔ لہٰذا طبیعت پر مزید بوجھ سے بچنے کے لیے ہلکے پُھلکے طنز و مزاح کے انداز میں سنیے کہ بیشک مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ روپے کا ہوتا ہے لیکن اُس رات اردو کا مردہ، مرے ہوے ہاتھی سے ڈبل قیمت (ڈھائی لاکھ روپے) میں بیچ کر دکھا دیا۔

ہوا یہ کہ اردو مرگھٹ کی روح رواں نے طویل منصوبہ بندی کے ذریعے اپنی اردو کے سالانہ عرس میں پھولوں کی چادر چڑھانے کا سہرا، ایک بہت ہی معزز پاکستانی امیریکن جوڑے کے سر باندھ دیا اور کمالِ ہوشیاری سے اپنے مشہورِ زمانہ سالانہ ڈرامے کا نام بھی اس خوبصورت جوڑے کی بے داغ پیشانی پر چپکا دیا۔

وہ ڈراما کیا ہے؟ ڈراما یہ ہے کہ امیریکا کے تمام اردو ادیبوں اور شعرائے کرام کو under the thumb رکھنے کے لیے ہر سال بیرونِ پاکستان اردو کی بہترین ادبی کتاب پر مصنّف کو ''انعام'' دینے کا ڈھونگ رچایا جائے۔ تاکہ تمام شعرائے کرام انعام و اکرام کے لالچ میں پھنس جائیں۔ اپنی عزّتِ نفس بیچ کر ناچنے گانے والوں کی طرح اردو مرگھٹ کے چکّر لگائیں۔ نام نہاد ''نان پرافٹ'' کاروباری مشاعروں میں اُن کے اشارئے ابرو پر نظر رکھیں۔ اور مہنگے مہنگے ٹکٹ خریدنے والوں کا دل بہلائیں۔ ڈراما کامیاب جا رہا تھا۔

اب دوسرا دلچسپ سوال یہ کہ انعام کس کو دیا جائے؟ تو بقول شخصے کہ اردو مرگھٹ میں بھٹکتی ہوئی اکلوتی روح رواں کی آپا دھاپی نے اس کا فیصلہ بھی کردیا کہ ''مان لو، ہوا میں پانچ جج بیٹھے ہیں، کسی کو نظر نہیں آرہے۔ بلکہ ایک دوسرے کو بھی نظر نہیں آرہے۔ اب اِس اندھیر نگری میں جان لو کہ اردو شاعروں کی تقدیر کا فیصلہ ہوگا۔''

اس کا سب سے بڑا نقصان اُس بدنصیب شاعر کو ہوتا ہے جس کے حق میں اردو کی مجاور صاحبہ اپنے فرضی ججوں کی طرف سے اپنا فیصلہ صادر فرماتی ہیں۔ بدنصیب شاعر، اگر تھوڑا سا غیرتمند بھی ہے تو دیدہ وروں سے اپنا منہ چھپائے چھپائے پھرتا ہے۔ کیوں کہ شاعر یا ادیب کے لیے اس سے بڑھ کر شرم کی بات اور کیا ہوگی کہ وہ مشکوک ہاتھوں سے اپنی دستاربندی کروالے؟

لہٰذا اب اردو مرگھٹ کو صاف ہاتھوں کی ضرورت پیدا ہوئی جو احمد ادایا کی طرح معصوم بھی ہوں، تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ پردے کے پیچھے کیا ہورہا ہے۔

معصوم آدمی میں ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی جیب پاکٹ سے ہوشیار نہیں رہتا۔ سب کو اپنی طرح معصوم سمجھتا ہے۔ ہمارے سیدھے سادے احمد ادایا سمجھے کہ اُن کو اس سال کے اردو افسانوں کی بہرتین کتاب کا اعلان کرنا ہے۔ وہ اس بڑھاپے میں اپنی نیند خراب کر کے تشریف لائے۔ ڈرامے کے اونچے سٹیج پر چڑھے۔ احساسِ نمے داری اور اپنی عزّت کے خیال سے انعام کے طور پر دی جانے والی ''پلیک'' غور سے دیکھی۔ اس میں ٹائپ کی ایک بھونڈی غلطی کی نشاندہی بھی کی۔ انعام کی حقدار صاحبہ کو لاؤڈسپیکر پر انعامی پلیک پر کندہ قابلِ صدرشک عبارت پڑھ کر سنائی تاکہ تمام حاضرین کو بھی معلوم ہو کہ انعام لینے والی کے لیے کتنی بڑی بات کہی گئی ہے۔ محترم احمد ادایا کی بیگم صاحبہ نے اپنے پرس سے پانچ ہزار ڈالرز کا چیک بھی لکھ دیا۔ اس کے جواب میں افسانہ نگار صاحبہ نے اپنی کتاب پیش کی۔

بھر فوٹو کی باری آئی۔ اتنے بڑے دل والے، اردو کے سرپرست جوڑے کے ساتھ فوٹو بھی ایک بڑا اعزاز تھا لیکن محترمہ افسانہ نگار صاحبہ کو بڑی مشکل سے فوٹو کے لیے روکا گیا۔ احمد ادایا صاحب نے کوشش کر کے اُن کے ہاتھ میں ٹیڑھی لٹکی ہوئی پلیک کو سیدھا کیا۔ تصویریں اُترنے تک ان کو روکا، لیکن پہلے ہی موقعے پر افسانہ نگار نے انعامی سند سٹیج پر چھوڑی، پانچ ہزار ڈالرز کا چیک پکڑا اور چمپت ہوگئیں۔

سب لوگ ان کو اشارے کرتے رہ گئے کہ بڑی بی! اپنے انعام کی پلیک تو لے جاؤ۔ وہ سمجھ رہے تھے کی احمد ادایا صاحب کی ناقدری کردی لیکن کسی نے افسانہ نگار کی قدر شناسی کی داد نہیں دی کہ احمد ادایا جیسے دس عدد معزّزین مل کر بھی پڑھ دیں، تب بھی ہوا میں بیٹھے ہوے فرضی ججوں کے فیصلے کی بھلا کیا قیمت؟ جب کہ احمد اور بیگم ادایا کے معتبر ہاتھوں سے لکھا چیک دنیا کے ہر بینک میں خالص سونے کی طرح لیا اور دیا جاتا ہے۔

سنا ہے کہ یہ تماشا انٹرنیٹ پر ساری دنیا نے دیکھا کہ امیریکا میں ''اردو کا مردہ'' جسے لوگ پانچ ڈالر میں بھی شاید نہیں خریدتے، احمد ادایا جیسے معصوم شخص کو پانچ ہزار ڈالرز میں بھیڑ دیا۔ مرے ہوے ہاتھی سے بھی ڈبل قیمت میں دو کوڑی کی ایک کتاب فروخت کردی۔

مگر یارو! یہ تو بتاؤ کہ اتنی ماہرانہ سیل پر کمیشن کتنا لیا گیا؟ پاکستانی امیریکن کمیونیٹی اس میں کوئی حصّہ بخرہ نہیں مانگتی مگر کم از کم اتنا خیال ضرور رکھو کہ

”اردو کا جنازہ ہے، ذرا دھوم سے نکلے!“

ـــ بشکریہ، ’’ہم لوگ‘‘ (Los Alamitos, California) ،
اشاعت ۱۲۹۹، ۵، صفحہ ٦ تا ۷